

دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط

(سورہ النحل کی آخری آیات کی روشنی میں)

اس جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

دعوت کے لیے زبان و اسلوب | کسی بھی سطح پر دعوت دینے کے لیے زبان کے مختلف نمونے اور کلام کے معیار قرآن مجید میں اور حدیث شریف میں موجود ہیں۔ قرآن حکیم نے شہریوں اور دیہاتیوں، عالموں اور عامیوں، سرداروں اور پیروکاروں سب کو مخاطب کیا ہے۔ اور پھر ہر قسم کے حالات میں طعن و طنز سنتے ہوئے بھی اور تشدد سہتے ہوئے بھی، صلح کی فضا میں بھی اور کشیدگی کے ماحول میں بھی، پُر امن سماجی مجالس میں بھی اور جنگی حالات میں بھی۔ اسلام کی دعوت دینے کا کام پیغمبر اور صحابہؓ نے جاری رکھا ہے۔ دعوت جتنے بھی مختلف اسالیب میں دی جاتی رہی، ان سب میں ایک مشترک معیار موجود ہے۔ اس معیار کو کبھی لپٹ نہیں ہونے دیا گیا۔

سو آج بھی داعیانِ اسلام کو دعوت کی زبان قرآن کے خطبوں اور رسول پاک کی تقریروں اور گفتگوؤں سے لینی چاہیے اور مختلف احوال و ظروف کے مطابق مختلف اسالیب سے کام لیتے ہوئے اصولی معیار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ تین چیزوں یعنی خلوص، راست گفتاری اور سنجیدگی کے عناصر داعیانِ حق کے کلام و خطاب میں کبھی ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔

حکمت کا اصل منشا یہ ہے کہ بصیرت مند داعی ہمیشہ اس بات پر نظر رکھے کہ کس وقت وہ کیسے مخاطبین سے بات کر رہا ہے، کن مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں کو اسلام کی طرف بلا رہا ہے، تاریخ کے کیا حوادث اس پاس نمودار ہو رہے ہیں، دوسری کونسی تحریکات یا کون سے نظریات اور مذاہب میدان میں کتنی کتنی طاقت اور کتنے کتنے اثر کے ساتھ موجود ہیں اور ان کے کمزور پہلو کیا ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی معاشرے

میں کیا مفید یا مضر تبدیلیاں آ رہی ہیں، کب دینِ حق کی کتنی پیش قدمی کدھر سے ممکن ہے۔ کئی موضوعات سے بات کا آغاز کر کے اسے کس طرح اصل دعائیک پہنچانا ہے، داعیِ حق کے پاس کتنی افرادی قوت ہے، کتنے وسائل قوت اسے حاصل ہیں، پیش نظر معاشرے سے کتنی حمایت اسے مل رہی ہے، علمی سطح پر کیسے خیالات پھیل رہے ہیں، تعلیمی دائرے میں نئی نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری کس طرح کی جا رہی ہے، مصافت و ادب کے ذریعے کس کس طرح کی لہریں دلوں میں اٹھ رہی ہیں، ثقافتی مظاہر اور تقاریب اور ادارے انسانی رجحانات کو کس طرف موڑ رہے ہیں، حکمران قوت اور سیاسی جماعتیں کیا پارٹ ادا کر رہی ہیں، پہلے سے موجود یا نووارد مذاہب کی تبلیغی سرگرمیاں کیا اور کیسی ہیں، خصوصاً خود اسلام ہی کے نام سے مختلف گروہ کس شانِ تفرقہ سے کام کر رہے ہیں، اور مخاطبین کی ذہنی و اخلاقی سطح کیا ہے؟

ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دعوت کا راستہ اور اسلوب متعین کرنا پڑتا ہے۔ اس کی رفتار اور تدریج کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔ نیز اسلام کی دعوت دینے والے اس امر کا بھی فیصلہ دینی حکمت سے کرتے ہیں کہ کن چیزوں سے تعرض نہیں کرنا ہے اور کن پر اولین توجہ دینی ہے، مقدم کیا ہے اور مؤخر کیا ہے، زور کس بات پر صرف کرنا ہے اور کن امور کو سرسری حد تک چھیڑنا ہے، کن طاقتوں سے ہم آہنگی ضروری ہے، کن کا تعاون حاصل کرنا ہے، کن کی مخالفت کرنی ہے، کن کو نظر انداز کرنا ہے۔

پھر حکمت ہی کے ذریعے بیٹے ہوتا ہے کہ قولِ لیتن (زمی گفتار) اور قولِ بلینغ (کلام دلنشین) سے کہاں کام لینا ہے، کون سے مواقع ہیں جہاں لکھ دینکھ ولی دین کہہ کر الگ ہو جانا مناسب ہوتا ہے، اور کن صورتوں میں داخلہ علیہم کی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ متلاشیانِ حق اور طالبانِ ہدایت سے معاملہ اور طرح ہوتا ہے، اور تکبر کیش منکرین و معاندین سے کسی اور انداز پر۔ لیکن سارے مختلف احوال و ظروف میں دعوت کے لیے قولِ سدید "کاجو ہر برقرار رہتا ہے، یعنی، کھری، واضح اور محکم بات اقولِ سدید کے لیے پیرایہ بیان بھی مناسب ہونا چاہیے۔ خطیبانہ ساجری اور واعظانہ نکتے اور فقیہانہ موشگافیاں دوسری چیز ہیں۔

مغربی ذہن کے مطالعہ کی اہمیت جس طرح حکمت کا تقاضا ملک ملک کے حالات کو سامنے رکھنا ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی دور میں جس تہذیب اور جس فلسفے کا غلبہ ہو، اور جن بھی سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی تصورات کا ذہنوں میں نفوذ غالب کر رہا ہو، ان کا داعیانِ حق کو شعور ہونا چاہیے۔

اہل مغرب آج فکری، اقتصادی، جنگی، سائنسی اور ثقافتی حیثیت سے دنیا کے امام بنے ہوئے ہیں۔ دوسری اقوام عالم کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی اس امامت سے متاثر ہیں۔ مسلمانوں کے پیش رو طبقے جو علمی، سیاسی اور اقتصادی برتری رکھتے ہیں، ان میں بکثرت افراد ایسے ہیں جو مغرب کی مروجہیت اور تقلید میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو غیر ارادی اور غیر شعوری طور سے مغربیت کی طرف طبیعتی چلی جا رہی ہے۔ پھر ایک عنصر وہ بھی ہے جو مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ و نظریات کی مخالفت کے مہم آلود پر بہت اچھی خدمات انجام دینے کے باوجود کسی قدر مجبوری و اضطرار کے ساتھ آہستہ آہستہ غلط اثرات قبول کر رہے ہیں، اور اس عنصر کی ایک نسل جہاں قدم جاتی ہے، دوسری نسل وٹاں سے پیپائی اختیار کرتی ہے۔

اس تہذیب نے کائنات و حیات کا خالص مادی تصور، انسانیت کا حیوانی تصور اور اخلاق کا انادی تصور علمی اور تعلیمی طریقہ اور پروپیگنڈے کے ذریعے ہر طرف پھیلا دیا ہے، اور ان تصورات کو اقوام مشرق اور مسلم معاشروں میں پہلے اپنے سیاسی سامراج کے ذریعے اور اب معاشی، فکری اور ثقافتی سامراج کے ذریعے ان کی جڑیں اور گہری کر دی ہیں۔ مغربی صنم خانہ افکار میں قومیں، مارکس، میکیا دیلی، ڈارون، بینٹھم اور فرائڈ کو دیوتاؤں کا مقام حاصل ہے، ہی، ستم یہ ہے کہ فرزندِ انِ حرم کے دماغوں میں بھی ان کے استعمار بن چکے ہیں۔

پس دنیا کے کسی کونے میں دعوتِ اسلامی کا کام کرنے والوں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ جدید دور کے پورے مادہ پرستانہ فلسفے، نظام سرمایہ داری، جمہوریت اور سوشلزم کا شعور حاصل کیے بغیر اور ان کے خلاف مضبوط تردیدی استدلال فراہم کیے بغیر دلوں کو فتح کر سکیں۔ جدید نظریات و تحریکات نے اس صحت مند ذہنی ماحول کو ختم کر دیا ہے جس میں آسانی سے فروغِ حق کا کام کیا جاسکتا تھا۔ انسانیت کے معیار میں اتنی پستی آگئی ہے، اخلاقی قدریں اس حد تک کمزور ہو چکی ہیں، دولت، جنس اور اقتدار اور دوسری خواہشات کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے، حقوق اور مفاد کے لیے قوموں طبقوں اور افراد میں سرکشی اتنی بڑھ چکی ہے، اور انفرادی سطح پر جرائم اور اجتماعی دائرے میں جبر و تشدد کا ایسا دور دورہ ہے کہ یہ ساری چیزیں جادۂ دعوتِ حق کے لیے خارزار بن چکی ہیں۔ محکم عقائد اور مسئلہ اصول شک کی زد میں ہیں۔ ہر سچائی کے خلاف اتنے سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، سوچ بچار کے علم میں اتنی طیڑھ آگئی

ہے، اور افہام و تفہیم کے لیے جن مشترک اساسیات پر انحصار کیا جاتا تھا ان کے متر لزل ہو جانے سے ایسا انتشار و افتراق پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامی دعوت کا کام پہلے سے مشکل تر معلوم ہوتا ہے۔ ان گزارشات کا مقصد مایوسی و پریشانی پیدا کرنا نہیں، اور نہ خود مجھے کوئی مایوسی و پریشانی لاحق ہے۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ جدید مغربی ذہن کا، جس کی پرچھائیں سے کچھ نہ کچھ حصہ ہر دماغ کو مل رہا ہے، بغور مطالعہ کیا جائے۔ آج کے فلسفہ اور سائنس اور سیاسی و اقتصادی نظریات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ اور ماقہ پرستانہ ذہنیت پر موثر حملہ کرنے کے لیے اس کے کمزور رخنے نگاہ میں ہونے چاہئیں۔ نیز اسلامی دعوت کے علمبرداروں کو مناسب استدلالی اسلحہ سے آراستہ ہونا چاہیے۔

موعظہ حسنہ حکمت کے بعد دعوتِ اسلامی کے لیے دوسری شرط **الْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ** ہے۔

موعظہ حسنہ کی شرط سے مراد یہ ہے کہ دعوت کی روح محبت و خیر خواہی ہونی چاہیے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ **الدَّيْنُ التَّصَيُّحَةُ** (روایت تیم داری۔ مسلم)۔ داعی کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ شہرت و ناموری مطلوب نہ ہو۔ مخاطب کو بغض و حسد اور کینہ و نفرت اور تحقیر و تمسخر کا نشانہ نہ بنایا جائے، اشتغال و التہاب کا انداز نہ ہو۔ دلائلِ کلام اور امثال اور مصطلحات ایسے ہوں کہ جو کچھ کہا جائے وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے یا کم از کم توجہ کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ دعوت علمی سطح پر ہو یا عوامی سطح پر، تحریر کی شکل میں ہو یا تقریر کی صورت میں، موفع کے لحاظ سے موثر الفاظ و عبارات اور اسالیب بیان اختیار کیے جائیں۔ داعی کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ کی شانِ کبریائی، رسولؐ کے شرف، قرآن کے مجد اور دین کے تقدس کا تقاضا یہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کا وقار تباہ نہ ہونے پائے اور کسی بھی صورت میں ساٹھ نہ طریق سے لجاجت اور خود شامہ کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔

جدالِ احسن | پھر ارشاد ہے کہ **جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ**۔ یعنی مکالمہ و مبادلہ نہایت خوبصورت انداز میں ہونا چاہیے۔ مطلوب یہ ہے کہ گفتگو میں اگر جدال اور مناظرے اور مبادلے کا انداز پیدا ہو جائے تو اس صورت میں داعی حق اپنے بہترین معیار کو برقرار رکھے۔ اس کے کسی انداز سے ظاہر نہ ہو کہ وہ حریف کو شکست دے کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، یا اس میں کبر و غور کا رنگ ہے، یا وہ مغالطہ انگیزی اور حق پوشی کر رہا ہے۔ جدالِ احسن وہی ہے جس میں دماغی کشتی کا انداز پیدا نہ

ہو۔ اور اینچ پیچ سے کام لے کر زبردستی بات بند کرنے کی راہ اختیار نہ کی جائے۔
 جدالِ احسن ترکیب پاتا ہے حسنِ مدعا، حسنِ استدلال اور حسنِ اظہار سے۔ اور ان خوبیوں کو احتیاطی
 بحثوں میں برقرار رکھنا بڑا مشکل ہے کیونکہ دونوں طرف تیز و تند جذبات ابھر آتے ہیں۔
 مخاطب اگر استہزاء و استخفاف، مغالطہ انگیزی اور یا وہ گوئی پر اتر آئے، فہمِ خدا میں بدیہی
 صداقتوں سے بھی انکار کرنے لگے، اہام و تفہیم کے بجائے جھگڑا لڑپن کی راہ اختیار کرے تو ظاہر
 ہے کہ جدالِ احسن کی فضا کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں داعیِ حق کو قائلو
 سَلَامًا (الفرقان ۶۳) پر عمل کرتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔

بہ طور وضاحت میں یہاں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ لفظِ جدال جس کے مفہوم میں مکالمہ و مذاکرہ سے کہے
 مباحثہ و مناظرہ تک کی مختلف اشکال شامل ہیں، اس کے ساتھ جب لفظ "احسن" بہ طور تعریف شامل ہو
 جاتا ہے تو مناظرہ وغیرہ کا جو بڑا مفہوم ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ گفتگو اور بحث
 اور تبادلہ خیالات کے لیے جب احسن استدلال اور احسن نکتہ اور احسن اختلاف کی شرائط سامنے رکھی
 جائیں گی تو گھٹیا طرز کے مقابلہ کلام کا تصور باقی ہی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام مالک نے مسئلہ
 تبلیغ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جدال کی اصطلاح ہی کو درکنار رکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

المِرَاعُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ علم میں جھگڑا اور بحثا بحثی علم
 يَذْهَبُ بِنُورِ الْعِلْمِ عَنِ کے نور کو بندے کے قلب سے
 قَلْبِ الْعَبْدِ نکال دے جاتی ہے۔

(امسالک - شرح موطا ج ۱ ص ۱۵)

سامعین میں سے ایک سائل نے پوچھا کہ جس شخص کو سنت کا علم ہو، کیا وہ حفاظتِ سنت
 کے لیے جدال کر سکتا ہے؟ (حضرت امام کے پر زور جذبہ حفاظتِ سنت کو غالباً سائل نے غاص
 طور سے سامنے رکھا) جواب میں فرمایا:

”نہیں، بلکہ اُسے چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ مان لے تو بہتر، ورنہ
 سکوت اختیار کرے۔“

حضرت امام نے نفیِ جدالِ احسن کی نہیں کی، بلکہ مراکے ساتھ محض جدال کی کہ ہے۔ جہاں تک

جدالِ احسن کا تعلق ہے، سو اسی کا ایک پہلو اپنے مطالعہ کتاب و سنت کی روشنی میں سائل کو بتایا۔ یعنی دوسروں کو کوئی بات کہنا یا بتانا درست، مگر یہ طرزِ فکر کہ مخاطب سے لازماً متوا کے چھوڑنا ہے اور اس پر ضرور اسے ٹھونسنا ہے، اس سے سارا کلام اور جدالِ غلط راستے پر پڑ جائے گا۔ جدالِ احسن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے دلائل و شواہد کی شکل میں غور و فکر کا مواد رکھ دیا جائے اور اسے ایسے معیارات سے متعارف کرایا جائے جن میں وہ اپنی آراء کو بطورِ خود پرکھ کر دیکھ لے کہ ان میں کتنا وزن ہے اور کیا کمزوری ہے۔ یہ جیسی ممکن ہے کہ مخاطب میں اپنی دعوت کے خلاف نفرت یا مزاحمت کے جذبات نہ پیدا ہونے دیے جائیں۔ جب کوئی شخص اپنی بات کو بزدل اور بھکار کہہ کر اور دوسرے کے خیالات کی تحقیر کر کے اپنا نقطہ نظر ٹھونسنا چاہتا ہے تو مخاطب اگر بظاہر خاموش بھی ہو جائے تو بھی اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔

تو مطلوبِ جدالِ مطلق نہیں، جدالِ احسن ہے!

(باقی)

ضروری تصحیح

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حاشی میں حسب ذیل غلطی کی اصلاح کر لیا جائے۔

صفحہ ۱۲۱۰ سطر ۹ فَاِخْتَلَفَ کے بجائے فَاِخْتَلَفَ لکھا جائے۔